1

علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی

محمد عبداللہ قریشی*

علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی دونوں کا خمیر محبت کے ضامن سے اٹھایا گیا تھا ۔ دونوں اخوت اسلامی کے رشتے میں بندھے ، ایک دوسرے کے نام کی مالا جپتے تھے ۔ بے نفس دوستی کی نیو تو اسی وقت جم گئی تھی جب دونوں نے لکھنا شروع کیا تھا اور اخبار و رسائل کے ذریعے ان کے رشحات قلم سامنے آنے لگے تھے ۔ خواجہ صاحب نے نثر نویسی میں کمال پیدا کیا ۔ ان کے البیلے اسلوب نگارش نے بہت جلد اردو دنیا سے اپنا لوہا منوا لیا ۔ علامہ اقبال نظم کے ذریعے اپنے افکار و خیال پیش کر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے ۔ شاعری سے ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ پڑھنے والوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں جو ان کے اپنے قلب و روح میں طوفان برپا کر رہے تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ :

''اگر میں خواجہ صاحب جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بناتا ۔''

اس کے برعکس خواجہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ :

''ڈاکٹر اقبال سلیس اردو پر قادر نہیں مگر جذبات کو متحرک و مضطرب کر دینے کی ان کو بڑی قدرت ہے ۔ حیات انسانی کی مختلف شاخوں پر جس خوبی سے وہ لکھتے ہیں اور جو سوز کی تاثیر پیدا کر سکتے ہیں ، اور کسی میں یہ بات کم پائی جائے گی ۔''[1]

بہر حال دونوں کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب خواجہ صاحب نے پنجاب کا چوتھا سفر کیا ۔ '' آپ بیتی '' خواجہ حسن نظامی کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنے والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خورد سالی میں کیے ۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ سلیمان چشتی قادری

*ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور ۔

۱۔ اتالیق خطوط نویسی از خواجہ حسن نظامی ، ص ۴۱ ۔

پہلواروی کی معیت میں بہاول پور کا ہوا ۔ اس سفر میں پہلی بار شیخ عبدالقادر مدیر مخزن سے ملاقات ہوئی ، جو اس زمانے میں اخبار و اسٹیج کے آفتاب بنے ہوئے تھے ۔ انھوں نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ ''شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڈھے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نو عمر ہیں ۔ آج دیکھ کر مجھ کو اپنے اندازے کی تصدیق ہو گئی کہ وہ صحیح تھا[۲] ۔''

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس میں شیخ محمد اقبال سے ملاقات ہوئی اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا نقش لے کر خواجہ صاحب دہلی واپس گئے ۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :

ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا ۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور میں انھوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کو دے دیا اور کہا :

''تمھارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو''

اراکین انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر نے اس کو خرید لیا ۔ اس جلسے میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی تھے ۔[۳]

یوں ایک ایسی مستحکم اور پائدار دوستی کی بنیاد قائم ہو گئی جسے زمانے کی کوئی گردش گزند نہ پہنچا سکی اور جس کی نسبت خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ ''ملنساری کا برتاؤ اور چیز ہے اور دوستی کسی اور شے کو کہتے ہیں ۔ دوستی ایک ناقابل ختم ملنساری ہے اور جیسی زندگی کو اس کی ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسر آتی ہے[۴] ۔''

اقبال کی زندگی تک میل ملاپ کا سلسلہ بھی جاری رہا اور خطوں کے ذریعے دلوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا ۔ اقبال کے سینکڑوں خطوں میں سے چند خط ، جو خواجہ صاحب کی کتاب ''اقالیق خطوط نویسی'' میں دیگر مشاہیر کے خطوں کے ساتھ نمونے کے طور پر محفوظ رہ گئے ہیں ، دونوں کے خوش گوار تعلقات کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویریں ہیں ۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی ۔ اس کے چار ایڈیشن بعد میں نکلے ۔ قیام پاکستان کے بعد

۲۔ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی ، ص ۶۹ ۔

۳۔ دیباچہ کتاب ''پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام'' ۔

۴۔ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی ، ص ۱۲۲ ۔

خواجہ صاحب نے اس کتاب سے اقبال کے خطوط الگ کر کے بھی شائع کیے اور اس کتابچے کا نام ''پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام'' رکھا ۔ دیباچہ میں اس اشاعت کی وجہ یہ بیان کی :

''اب ان خطوط کو اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ پاکستان بن گیا ہے ، جس کا خیال سب سے پہلے ان کے دل میں آیا تھا اور اُنھوں نے بار بار زبانی مجھے پاکستان کا منصوبہ سنایا تھا مگر اس منصوبے میں ہندوستان کی تقسیم کا خیال نہیں تھا بلکہ ساری اسلامی دنیا کے اتحاد کو وہ پاکستان کہتے تھے ؛ البتہ ان کا خیال تھا کہ پاکستان ہندوستان میں بنایا جائے اور ساری اسلامی دنیا کا ہندوستان مرکز بن جائے ۔ ان خطوں میں بھی اس خیال کے اشارات کئی جگہ ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار میرے پاس دہلی آئے اور میں بھی کئی بار ان کے پاس لاہور آتا جاتا رہا ۔''

دوسری وجہ اس غلط فہمی کا ازالہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب میں مثنوی ''اسرار خودی'' کی اشاعت پر اختلاف ہوگیا تھا ۔ اس کی نسبت خواجہ صاحب نے وضاحت فرمائی :

''مثنوی اسرار خودی کے بنیادی اصول میں مجھے ان سے اختلاف نہ تھا ۔ بلکہ حضرت حافظ وغیرہ شعرا اور مشائخ صوفیہ کے بعض خیالات کی نسبت جو کچھ اُنھوں نے لکھا ، میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ان سے اختلاف کیا تھا ، جس کو مخالفین نے اصل حقیقت سے بڑھا چڑھا کر مشہور کیا تھا مگر اقبال آخر تک میرے دوست رہے اور ان کے برتاؤ میں کچھ فرق نہیں آیا ۔

''بہرحال اب میرے مرنے کا وقت قریب ہے اس لیے میں ان خطوط کو اس غرض سے شائع کرتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باشندگان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور ان کو ان خطوط سے اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اپنی مثنوی کا نام رکھنے سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا تھا ۔

''میرا ایمان ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صرف ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ پوری ایشیا کے ہیرو اور لیڈر تھے اور ایشیا کی بیداری ان کی برکات باطن کا نتیجہ تھی[۵] ۔''

اقبال کے یہی خطوط شیخ عطاء اللہ مرحوم نے ''اتالیق خطوط نویسی'' سے لے کر اپنی تالیف ''اقبال نامہ'' میں شامل کیے ہیں ۔ چونکہ ''اقبال نامہ'' نہایت آسانی

۵- دیباچہ کتاب ''پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام۔''

سے دستیاب ہو جاتا ہے ، اس لیے آئندہ مضمون میں جہاں ضرورت پیش آئے گی اسی کے حوالے دیے جائیں گے ۔

خواجہ حسن نظامی کی ابتدائی زندگی بڑی عسرت و تنگدستی اور نہایت مشکلات سے گزری ۔ برادری کے لوگ ان سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے ۔ ان کو قوت لایموت حاصل کرنے کے لیے کئی قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے اور بے حد دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی ۔ اسی محنت و مشقت نے ان کو کامیابی سے ہمکنار کر کے فائز المرام کیا ۔ ۱۹۰۴ع میں خاندان کے کسی دشمن نے ان کے مرنے کی بدخبر اڑائی ۔ بعد میں اس کی تردید ہوگئی ۔ علامہ اقبال نے اپنے ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ع کے خط میں خواجہ صاحب کو لکھا :

''دو دفعہ پیسہ اخبار میں میں نے وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لاہور کے دوستوں کو بے انتہا تشویش تھی مگر قدرت خدا کی مجھے مطلق رنج نہ محسوس ہوا اور اسی بنا پر جس دوست نے مجھ سے پوچھا میں نے بے تکلف کہ دیا کہ خبر غلط ہے ۔ الحمد للہ کہ ایسا ہی ثابت ہوا اور میں لاہور کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہوگیا ۔ ایسی خبریں زیادتیٔ عمر کی علامت ہیں . . . اس خبر سے کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ ملک کو آپ کی کس قدر ضرورت ہے ۔ انشاءاللہ میں بھی تعطیلوں میں ، اگر ممکن ہوا تو ، آپ سے دہلی میں ملوں گا[۶] ۔''

۱۹۰۵-۶ع میں خواجہ صاحب ہندو فقیروں ، سادھوؤں ، جوگیوں اور ان کے متبرک تیرتھوں کی سیر کے شوق میں متھرا ، بنارس ، بندراہن ، ہردوار ، جگن ناتھ وغیرہ گئے اور ایک رسالہ ''تیرتھ یاترا'' بھی لکھا ۔ اس سفر میں اقبال قدم قدم پر یاد آئے ۔ وہ ان دنوں کیمبرج میں زیر تعلیم تھے ۔ انھوں نے وہاں سے ۲۵ اپریل ۱۹۰۶ع کو لکھا :

''سرمست سیاح کو سلام ۔ متھرا ، ہردوار ، جگن ناتھ ، امرناتھ جی سب کی سیر کی ۔ مبارک ہو ۔ مگر بنارس جا کر لیلام ہو گئے ، کیوں ٹھیک ہے نا ؟ بلکہ ہمارے میر نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے ۔

''میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشک صنعت آزری ہے ۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے ؟ خدا کی قسم ! بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ ۔ میں تو ہر ہر قدم پر آپ کو یاد آتا تھا ۔ کیوں

۶۔ اقبال نامہ ، مرتبہ شیخ عطاءاللہ ، جلد دوم ، ص ۳۵۲ ۔

نہ یاد آؤں ؟ آپ بھی ہم کو یہاں عموماً یاد آیا کرتے ہیں؟ ۔''

اقبال کو انگلستان اور جرمنی میں جو علمی فتوحات حاصل ہو رہی تھیں ، ان کو خواجہ صاحب خوب اچھالتے تھے ۔ اس بنا پر بعض دوست خواجہ صاحب ہی کو قابل مبارکباد سمجھتے تھے ۔ اقبال نے ۱۰ فروری ۱۹۰۸ع کو لندن سے خواجہ صاحب کو لکھا :

''میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارک باد دیتے ہیں ، راستی پر ہیں ۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے ۔ دیکھنے کو دو ، حقیقت میں ایک[۸] ۔''

ولایت سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر واپس آنے پر بھی خواجہ صاحب نے اقبال کی شان میں بہت کچھ لکھا ۔ اس احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ع کو سیالکوٹ سے اقبال نے نہایت انکسار سے تحریر فرمایا :

''آپ لوگوں کو میرا مشتاق بناتے ہیں ، مجھے کچھ اعتراض نہیں مگر اندیشہ ہے کہ مجھ سے مل کر انھیں مایوسی نہ ہو ۔ آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصور کیجیے مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بے تاب کر رکھا ہے ، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا ، جو مجھے تنہائی میں رلاتا ہے اس کی وجہ مجھ سے پہلے سن لیجیے ، پھر جو چاہے کیجیے ۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے ساتھ[۹] ۔''

۲۴ جون ۱۹۱۲ع کو حضرت علامہ پھر لکھتے ہیں :

''آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کیا کروں ، علائق نہیں چھوڑتے ۔ روٹی کا دھندا لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا ۔ کیا کروں عجب طرح کا قفس ہے[۱۰] ۔''

ہندوستان میں احیائے اسلام کی خاطر جو بزرگ اس وقت مختلف حلقوں میں کام کر رہے تھے ، اخبار توحید میرٹھ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ

۷۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۵۶ ۔
۸۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۵۸ ۔
۹۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۶۰ - ۳۶۱ ۔
۱۰۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۶۵ ۔

صاحب سے اقبال کا نام کسی وجہ سے چوک گیا تھا ۔ اقبال نے اس فروگذاشت پر دوستانہ شکوہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کو لکھا :

''خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپ نے ہندوستان کے پرانے بت کدے میں توحید کی مشعل روشن کی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ دل اس کی حدّت سے گرمائیں گے اور آنکھیں اس کے نور سے منوّر ہوں گی ۔ میں بھی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا ۔

مسلمانان ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب ، جو آپ نے اس ہفتے کے ''توحید'' میں ارقام فرمائے ہیں ، بالکل بجا ہیں ۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال ، جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار ، کامریڈ ، بلقان ، طرابلس اور نواب وقارالملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے ، کس کا خوشہ چین ہے ؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام برا بھلا جو کچھ بھی ہو ، غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بین آنکھیں مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں ۔

''اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو ۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقف حال دوست کی غلط فہمی دور ہو تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانان ہندوستان کی بیداری میں حصہ نہیں لیا''[11] :

بکلام بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسی نمی طلبد ز تو صلہ دگر مگر آفریں

١٩١٤ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ اجلاس میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ میں چند چھوٹی چھوٹی طنزیہ و مزاحیہ نظمیں سنائیں ۔ انھوں نے تو مذاقاً ان کا عنوان ''رگڑا'' رکھا تھا مگر وہ کتابی صورت میں ''اکبری اقبال'' کے نام سے شائع ہوئیں ۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی نہایت شگفتہ تمہید لکھی ۔ کتاب ''اکبری اقبال'' اب نایاب ہے ۔ اس کی بعض منتخب نظمیں ''بانگ درا'' میں آگئی ہیں ۔ البتہ خواجہ صاحب کی تمہید ، جو تبرک کا درجہ رکھتی ہے ، ان کی یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کے لیے ذیل میں درج کی جاتی ہے :

''لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں ، جن کا نام محمد اقبال

١١- اقبال نامہ ، جلد ٢ ، صفحہ ٣٦٥ - ٣٦٦ -

ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی ہے ۔ وہ شعر گاتے ، شعر بجاتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہیں ۔

''میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال اُن کو آدمی ہی نظر آتے ہیں ، کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ، ورنہ میں اقبال کو بیکر خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا ۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کی بیوی بچوں یا ان کے لیے مبارک ہو ، جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقل مند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں ۔

''میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی ، سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی ، یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی ۔ مگر آدمی کبھی نہیں پایا ۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیات ابدی کے نشان ہیں ۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہندوستان کے کسی انسان میں نہیں ۔

''برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں ۔ مگر ایک آدمی کو ستانا اور مگس بے حیا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رخ پر قربان ہو جاتا اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رلاتا ہے ۔

''اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے ۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں ۔

''اقبال ہمیشہ آسمان پر اڑتے ہیں ۔ زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے ۔ اس لیے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں ، یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں ؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں ؟

''ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے ، جو زمانے کی زبان کہلاتے ہیں ، جن کا نام اکبر ہے ، جو الہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں ۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے ۔ اکبر اشارات ربانی کے حامل ہیں ۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے ، پھر قلم سے لکھواتا ہے ۔ اکبر کی ہر بات زمین اور آسمان کو ایک کر دیتی ہے ۔ ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں ۔ اکبر نے اُس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں ، جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا ۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ ''اکبری اقبال'' ہے ۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبر کی روش کو نبھایا ہے اور اکبر کی طرح کیوں کر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر

دیکھنا یہ تھا زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے - خدا خیر کرے - دیکھیے ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے -

''ہندو استھان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں ، جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو ، عبرت کے لیے دل خوش کن آگاہی و تنبیہ ہو - اکبر و اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرایے سے - اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعے شائع ہوئی ہے ، اقبال نے اکبری نقش قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے - مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ''ریویو'' کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکچر دے - موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے ، تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرائیں گی ، سواریوں کو چکر آئیں گے ، بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے ، فضول ہے - جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے - اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے -''

۱۹۱۵ع کے آغاز میں خواجہ صاحب نے اقبال کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''سرّالوصال'' کا خطاب عطا فرمایا - اقبال نے ۶ فروری ۱۹۱۵ع کے خط میں لکھا :

''آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے ، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے ، اب قریباً تیار ہے اور پریس میں جانے کو ہے - اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائیے - شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کا نام اسرار حیات ، پیام سروش ، پیام نو ، آئین نو تجویز کیے ہیں - آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کر سکوں[۱۲] -''

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ صاحب نے کون کون سے نام تجویز کیے البتہ اقبال نے اس مثنوی کو ''اسرار خودی'' کے نام سے شائع کیا - خواجہ حسن نظامی جون ۱۹۵۰ع کے ''منادی'' میں لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا نام میں نے تجویز کیا تھا -

۱۲- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۶۸ -

اور بھی کئی نام تجویز کیے تھے مگر انھوں نے اس کو پسند کیا[۱۳]۔"

مثنوی اسرار خودی کا شائع ہونا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ چونکہ مثنوی کا علم کلام عام سطح سے بلند تھا ، اس لیے تصوف کے بعض مسائل مثلاً وحدت الوجود ، تنزلات ستہ اور ترک دنیا (رہبانیت) وغیرہ سے لوگوں نے اختلاف کیا اور مخالفت کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا ۔ بعض صوفی ، پیر اور سجادہ نشین ، جنھیں روایات باطلہ کی پابندی اور شریعت حقہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا ، اقبال کے خلاف صف آرا ہو گئے اور انھوں نے خوب خوب ضربیں لگائیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور ان کے مرید اس جنگ میں سب سے پیش پیش تھے ۔ خواجہ صاحب نے اس بات کا تو اعتراف کیا کہ :

"حضرت اقبال کے کمال شاعری ، سوز و گداز اور اس اثر سے انکار کرنا ، جس نے مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بیدار کیا ، آفتاب کے وجود سے انکار کرنا ہے ۔ وہ میرے اُس زمانے سے دوست ہیں جب ان کی کارگزاری نے نیا نیا نشان بلند کیا تھا ۔ میں ہمیشہ ان کے علم کے نیچے رہا ۔ میں نے زبان سے ، قلم سے اور ہر ایک طریقے سے ، جس پر مجھ کو قابو تھا ، اقبال کے خیالات کی تبلیغ کی ۔ میرے عقیدے میں اقبال کا پایہ اس توصیف سے بھی کہیں بلند ہے جس کو جناب "کشاف" نے بیان کیا ہے[۱۴]۔"

لیکن اس کے باوجود مثنوی کے خلاف نہ صرف خود نہایت زور دار مضامین لکھے بلکہ دوسروں سے بھی لکھوائے ۔ آپ نے کہا :

"میں اقبال کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا ، اس لیے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں ، اس لیے نہیں کہ وہ بڑے آدمی ہیں بلکہ اس لیے کہ سالہا سال سے میں ان کے خیال و ارادہ کو جانتا ہوں ۔ انھوں نے تو یہ مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدے کے لیے لکھی ہو گی مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہوں گے اور مسلمانوں کے اصولی عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا ۔ در حقیقت یہ مثنوی اقبال کی نہیں بلکہ اقتضائے وقت کی لسان حال ہے ۔ وقت کی خواہش ہے کہ مشرق

۱۳۔ ماہنامہ منادی ، دہلی ، بابت جون ۱۹۵۰ء ۔
۱۴۔ مضمون کشاف خودی از خواجہ حسن نظامی ، مطبوعہ وکیل امرتسر ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء و مجلہ اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۶ ۔

مغربی بن جائیں مگر کیا وہ ایسا کر سکے گا ؟ اس سے کہ دو کہ نہیں :

سانچے گرو کا بالکا مرے نہ مارا جائے

''حضرت حافظ (شیرازی) کی اقبال نے کیسی آبرو ریزی کی ہے ، کیسے کریہہ الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے ۔ اگر وہ سچے ہیں کہ حافظ کے کلام نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا ، تو میں پوچھوں گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دنیاے مردار کی مذمت کی تھی اس سے مسلمانوں کی ہمت نہ ٹوٹی ؟ حضور اور سب صحابہ دین کو مقدم اور دنیا کو موخر کہتے تھے ۔ انھوں نے کیسی کیسی فتوحات کیں ۔ اسرار خودی دنیا کو مقدم کہہ کر کیا دکھا سکے گی ؟

''اسرار خودی میں کن کن یورپین فلاسفروں کی روح ہے ؟ اس کو ذرا سمجھ لینے دو ۔ گو ہم بے علم ہیں ، بے سہارے ہیں مگر دین کی حمایت میں ہم سے جو کچھ بن پڑے گا ، کریں گے ۔ اقبال سے خدا نخواستہ دشمنی نہیں لیکن دوستی کو عقائد میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں ۔ مسلمان اپنی مذہبی رائے میں کسی دنیاوی تعلق کا پابند نہیں ہو سکتا ، لہذا میں بھی نہیں ہوں[۱۵] ۔''

اسی پر بس نہیں کی ، خواجہ صاحب نے مندرجہ ذیل آٹھ سوال مرتب کر کے بعض مشائخ کرام کے پاس بھیجے اور ان کے جوابات کی ، جو مثنوی پڑھے بغیر دیے گئے تھے ، خوب خوب اشاعت کی ۔

(۱) کیا قرآن شریف عقیدۂ وحدت الوجود کا مخالف ہے ؟

(۲) کیا توحید اور وحدت الوجود دو جداگانہ اشیا ہیں ؟

(۳) کیا اسلام صرف انانیت مٹانے کو آیا ہے ؟

(۴) تصوف کا انتہائی نتیجہ اور مقصود کیا ہے ؟

(۵) کیا صحابۂ کرام میں کیف سُکر مثل خواجہ حافظ شیرازی کے کسی میں نہ تھا ؟

(۶) صوفیوں کی حالت سلوک کے کسی مقام کو مفید ہے یا نہیں ؟

(۷) کیا کیفیت وحدت الوجود کسی مقام کا نام ہے اور اس مقام کے بعد کیا مقام ہے ؟ کیا حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد عدم محض تسلیم کیا ہے اور یہ مذہبی امور میں مفید ہے یا نہیں ؟

(۸) کیا وحدت الوجود محض علمی مسئلہ ہے یا اس کو مذہب سے بھی کچھ تعلق ہے ؟

اس سے بھی آگے بڑھ کر ۳۰ جون ۱۹۱۶ء کے رسالہ ''خطیب'' دہلی میں

۱۵- سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۳ء ، ص ۷۸-۷۹ -

خواجہ صاحب نے ''سرِّ اسرار خودی'' کے عنوان سے مثنوی کے اصول پر بحث کی اور مندرجہ ذیل پانچ وجوہ کی بنا پر اسے نامعقول قرار دیا :

''اول یہ کہ اقبال نے اس مثنوی میں خودی کی حفاظت پر جو کچھ لکھا ہے ، وہ کچھ انوکھا اور نرالا نہیں بلکہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہت ہی کم ہے ، لہٰذا بمقابلہٗ قرآن اس کی ضرورت نہیں ۔

دوم یہ کہ دیباچے میں مسئلہٗ وحدت الوجود اور صوفیوں کو ملزم قرار دیا گیا ہے کہ ترک خودی کا جذبہ اس مسئلے اور وحدت الوجود کے مقلد صوفیہ کے سبب قوم میں پیدا ہوا ۔ پرائیویٹ خط و کتابت میں بھی حضرت اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے اور ان کے احباب بھی صاف صاف کہتے ہیں کہ اس مثنوی کا اصل مقصد صوفی تحریک کا دنیا سے مٹانا ہے ۔ پس چونکہ ان کا ارادہ بے بنیاد ہے اور وہ قیامت تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے ، لہٰذا میں بھی اس مثنوی کو بے نتیجہ تصور کرتا ہوں اور لغویت سے اختلاف ضروری ہے ۔

سوم مصنف نے دیباچے میں مسلمانوں کو بہ پیرویٔ حکمائے یورپ اپنے عقائد بدل دینے کی صلاح دی ہے ۔

چہارم یہ مثنوی گو خود داری سکھاتی ہے مگر ساتھ ہی اس کے مغربی خود غرضی بھی سکھاتی ہے ، جو اسلام کے سراسر خلاف ہے ۔

پنجم اس مثنوی نے میری خودی کی توہین کی ہے ۔''

جب علامہ اقبال کے عقائد کی نسبت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلنی شروع ہوئیں اور مسائل کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا تو انھوں نے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دینے اور اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے خود بھی چند مضامین لکھے جو اس وقت کے اخباروں بالخصوص ''وکیل'' امرتسر ''نیو ایرا'' لکھنؤ میں شائع ہوئے ۔ خواجہ حسن نظامی کو خاص طور پر مخاطب کرکے آپ نے فرمایا :

''مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے عشق ہے ۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں ، بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے ۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا ہے کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے ۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ

ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا[۱۶] ۔''

اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک ایک کرکے ہر اعتراض کا جواب نہایت وضاحت اور جامعیت سے دیا ۔ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلے میں بھی بڑی صاف گوئی اور استدلال سے کام لیا ۔ بڑے آدمیوں کی طرح کوئی ایسی بات نہ کی جس سے موقع بہ موقع کترا کے نکل جانے کی گنجائش باقی رہے ۔ ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا ۔ وہ فلسفی اور مفکر ہونے کے علاوہ بہت اچھے قانون دان بھی تھے ۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے ، اس میں جذبات کو اتنا دخل نہ ہوتا جتنا کہ سوچ سمجھ اور فکر و تدبر کو دخل ہوتا تھا ۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اس میں مغز کے علاوہ ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط بھی تھا ۔ چنانچہ اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا :

''مندرجہ بالا سطور سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ فلسفیانہ اور مؤرخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے ۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے ۔ کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبت رسول اللہؐ ہے اور جو اس ذریعے سے ذات باری سے تعلق پیدا کرکے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں ۔ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا ۔''

اس موقع پر حضرت اکبر الہ آبادی نے ثالث بالخیر کا کردار ادا کیا ۔ انھوں نے پہلے تو اس مخالفت کو کوئی اہمیت ہی نہ دی بلکہ سرسری طور پر اپنے رنگ میں کہہ دیا :

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی آن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لیے — آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لیے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
بست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص[۱۷]

۱۶- سہ ماہی اقبال لاہور ، اپریل ۱۹۵۴ع ، ص ۴۴ ۔
۱۷- خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی (۱۹۲۲ع) ص ۲۴ ۔

لیکن جب معاملہ حد سے بڑھ گیا اور بحث الٹی سیدھی ہونے لگی تو ایک طرف علامہ صاحب کو روکا اور دوسری طرف خواجہ صاحب کو پُرخلوص مشورہ دیا :

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لیے جنون ہے تم کو اگر دیووں کے لیے بنے سلیماں وہ بھی[۱۸]

میں اس تمام بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون ''معرکۂ اسرار خودی'' میں بیان کر چکا ہوں ، جو رسالہ ''اقبال'' لاہور بابت اکتوبر ۱۹۵۳ع اور اپریل ۱۹۵۴ع میں چھپ چکا ہے ۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ لب لباب یہ ہے کہ اقبال کو اس قلمی جنگ میں کامیابی ہوئی ۔ انھوں نے مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں بعض جگہ لفظی ترمیمیں کرکے میدان مار لیا ۔ ان کا فلسفۂ خودی مقبول خاص و عام ہوا اور خواجہ حسن نظامی بھی پہلے کی طرح ہمنوا اور شیر و شکر ہوکر اقبال کی دوستی کا دم بھرنے لگے ۔

۱۹۱۸ع میں پھر غلط فہمی کے امکانات پیدا ہوئے لیکن بات بڑھنے نہ پائی ۔ پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے روز نامہ ''زمیندار'' پر حکومت ہند نے پابندی لگا کر مولانا ظفر علی خاں کو ان کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا تھا مگر انھوں نے سیاست سے کنارہ کش رہنے کا وعدہ کرکے ہفتہ وار ''ستارۂ صبح'' جاری کر لیا تھا ۔ گرمیٔ بازار کی خاطر انھوں نے جھوٹے تصوف اور پیشہ ور صوفیوں اور پیروں کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا ۔ اس پر خواجہ حسن نظامی کو شبہ گزرا کہ یہ علامہ اقبال کی شہ پر ہو رہا ہے ۔ بدمزگی بڑھنے ہی والی تھی کہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے مشترک دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے خواجہ صاحب کو وضاحتی خط لکھ کر مغالطہ دور کر دیا ۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اقبال کو معذرت کا خط لکھا :

''محب الفقرا جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب !

السلام علیکم ۔ آج محبی میر نیرنگ صاحب کے خط نے مجھے ایک بڑے مغالطے سے بچا لیا اور میں ان کا ازحد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی طمانیت کا اظہار کر کے مجھے ایک بد گمانی کے گناہ سے نجات دی ۔ میں آپ سے معذرت کرنے کو یہ خط لکھتا ہوں ۔ مجھے لاہور کے متعدد حضرات نے تحریری و زبانی اطلاعیں دی تھیں کہ اخبار ستارۂ صبح کی آڑ میں آپ ہیں مگر مجھے میر نیرنگ کا سب سے زیادہ یقین ہے ۔ اس لیے میں اپنی بدگمانی کو واپس لے کر آپ سے عذر

۱۸- خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی (۱۹۲۲ع) ، ص ۳۹ ۔

کرتا ہوں ۔ اب مجھے اس تگ و دو میں آپ سے کوئی سروکار نہ ہوگا ۔
مخلص دیرینہ حسن نظامی[۱۹]''

اس معذرت نامے کے جواب میں ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ع کو علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو جو خط لکھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے :

''مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب !
السلام علیکم ۔ آپ کا خط کئی دن سے آیا رکھا ہے ۔ مجھے مصروفیت رہی ، اس وجہ سے جواب نہ لکھ سکا ۔ معاف کیجیے گا ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میر نیرنگ صاحب نے آپ کو خط لکھا ہے ، جس نے آپ کو ''بد گمانی کے گناہ'' سے بچا لیا ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ۔
آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے اُن اعتراضات کے جواب میں ، جو آپ نے مثنوی ''اسرار خودی'' پر کیے تھے ، چند مضامین مسائل تصوف پر لکھے تھے ، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلہ وحدت الوجود ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے ، قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق صحو ہے نہ کہ سُکر ۔ آپ ہی کے اخبار ''خطیب'' میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا ۔ باوجود اس کے مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمن تصوف سمجھتے ہیں ؟ یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں بلکہ حضرات صوفیہ میں ایک عرصے سے موجود ہے ۔ بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار ''وکیل'' میں کیا تھا اُن کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے ، گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیرضروری جانتا ہوں ۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لیے موزوں ہیں ۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر (الہ آبادی) نے (جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے ۔ اُس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی ۔ گو ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں ۔ اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اخبار ستارۂ صبح میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو وجہ اُن دیرینہ تعلقات کے ، جو میرے اور ان کے درمیان ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے ، بعض لوگوں کو بدگمانی ہوئی کہ ستارۂ صبح کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں — ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے ، بلکہ

۱۹۔ انوار اقبال ، ص ۱۸۳ ۔

پرائیویٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے ان سے اختلاف کیا ہے ۔ اس کے علاوہ میں تو اصولی بحث کو ، جیسا کہ اُوپر عرض کر چکا ہوں ، اخباروں کے لیے موزوں نہیں سمجھتا ، چہ جائیکہ کسی اور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں ۔ البتہ موجودہ نتائج کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجے میں ان کے خیالات و رسوم کی تنقید کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا ۔ اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ اس طرف توجہ کریں تو چشم ما روشن دل ما شاد ۔ غرض کہ آپ کو میری نسبت بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تھی تو آپ مجھ سے براہ راست دریافت کر سکتے تھے ۔ لوگ تو اس قسم کی باتیں اڑایا ہی کرتے ہیں ۔ دو چار روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آئندہ کے لیے توبہ کی ہے ۔ میں نے اُنھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے ، اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظے کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے ۔ لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی کی طرف سے منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ اگر آپ چاہیں تو یہ خط شائع کر سکتے ہیں ۔ والسلام محمد اقبال از لاہور ۲۰

اس مراسلت کے بعد خواجہ حسن نظامی نے ایک مضمون اپنے ہفت روزہ اخبار ''خطیب'' میں لکھا جس کا عنوان تھا ''جناب اقبال و حسن نظامی'' ۔ اس میں یہ اعلان کیا :

''گزشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلہ تصوف میں اختلاف واقع ہوا تھا ۔ گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے روکا اور دوسری جانب مجھے بھی ممانعت فرمائی ۔ میں حضرت اکبر کی ذات کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتا ہوں ، اس لیے گفتگو سے دست بردار ہوگیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کر سکا ۔ کیونکہ بدنامی بہتر تھی اپنے رہنمائے روح کی عدم تعمیل ارشاد سے''۲۱

۱۹۳۵ء میں دہلی کے ہندو مسلمان اہلِ علم نے جناب سری رام آنجہانی مصنف خم خانۂ جاوید (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء) کے مکان پر جمع ہو کر ''غالب

۲۰- انوار اقبال ص ۱۸۴ - ۱۸۶ -
۲۱- انوار اقبال حاشیہ ص ۱۸۶ -

سوسائٹی'' قائم کی ۔ اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ، نائب صدر پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ، خواجہ حسن نظامی اور لالہ دیش بندھو گپتا تھے اور سیکرٹری میر محمد حسین مالک فرم زنگی قلم ، آغا محمد اشرف نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد اور جناب عشرت رحمانی تھے ۔ اس سوسائٹی نے ۱۵ فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی میں پہلا ''یوم غالب'' بڑے وسیع پیمانے پر منایا ۔ اراکین انجمن کے مشورے سے خواجہ حسن نظامی نے مقامی و بیرونی ہندو مسلم مشاہیر کو شرکت کی دعوت دی اور ہندوستان کے علمی سرپرستوں اور والیان ریاست کو ''غالب ڈے'' کی امداد و اعانت کے لیے تار بھیجے ۔ علامہ اقبال ان دنوں بیمار تھے ، اس لیے خود تو بہ نفس نفیس تقریبات میں شریک نہ ہو سکے مگر انھوں نے اپنا الہامی پیغام خواجہ حسن نظامی کے نام بھیج دیا جو حسب ذیل تھا :

جناب خواجہ صاحب ! دو سال سے علیل ہوں :

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی کہ من با خویش دارم گفتگوے*

پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو میرزا ہرگوپال تفتہ کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لیے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہوگئی :

دریں محفل کہ افسون فرنگ از خود برد او را
نگاہے پردہ سوز آور دلے دانائے راز آور
مئے ایں ساقیان لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیض حضرت غالب بیاں پیمانہ باز آور

زیادہ کیا عرض کروں ، سوا اس کے کہ دعاؤں کا محتاج ہوں ۔ ہاں دلی کے پنڈتوں سے سلام کہہ دیجیے ۔ محمد اقبال ۲۲

۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب نے میلادی جنتری بابت ۱۳۵۵ ہجری شائع کی ۔ اس میں انہوں نے جہاں اور بہت سی جدتیں پیدا کیں ، وہاں بہت سے مشاہیر کے قلمی چہرے اپنے مخصوص انداز میں لکھے اور اپنے دوست اقبال کے قلمی چہرے میں نہایت پیار سے یوں رنگ بھرے :

''سرو قد ، گندمی رنگ ، پر تمکنت چہرہ ، ڈاڑھی صاف ۔ شاعر بھی ہیں ،

*پیام مشرق ، ص ۶۹ ۔

۲۲- منادی دہلی ۲۱-۲۸ فروری ۱۹۳۶ء ۔ غالب ڈے کی مکمل روئداد میرے مضمون ''عظمت غالب'' مطبوعہ اقبال ریویو کراچی جولائی ۱۹۶۵ء میں ملاحظہ فرمائیے ۔

نثر نویس بھی ہیں ، بیرسٹر بھی ہیں ، سر بھی ہیں ، لیڈر بھی ہیں اور پھر صاحب اقبال بھی ہیں ۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ تو دوسری میں عمر خیام کا خم خانہ ، جسم پنجابی ، دماغ فلسفی ، خیال صوفی ، دل مسلمان ۔ پہلے شاعر بنے ، پھر بیرسٹر ہوئے اور اب لیڈر ہیں ۔ انگریزی زبان پر پورا قابو رکھتے ہیں لیکن انگریزیت کے قابو میں نہیں آتے ۔ انگریز ان کو سمجھتا ہے اور انگریز کو یہ سمجھتے ہیں ۔ اگر انگریز کو سمجھنا نہ جانتے تو نہ سر بنتے اور نہ گول میز کانفرنس میں نظر آتے ۔ عربی بھی جانتے ہیں اور فارسی بھی جانتے ہیں ۔ فارسی اتنی اچھی جانتے ہیں کہ اگر خاقانی اور انوری کے زمانے میں ہوتے تو دوسرے خاقانی اور انوری مانے جاتے ۔ مسلک حق پسندی ، پیشہ علمی خدمت ، مذہب مسلمانوں کی بہبودی ۔ مزاج میں سنجیدگی ، متانت اور استقلال ۔ یعنی شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ تلون مزاجی نہیں ہے ۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی عشق باز ہے لیکن ان کی شاعری کو گل و بلبل سے عشق نہیں ہے ۔ ان کی شاعری کو قوم اور وطن سے عشق کرنے میں لطف آتا ہے ۔ انگریز کی نظر میں پسندیدہ ہیں ، مسلمان کی نظر میں محبوب ہیں ، ہندو کی نظر میں اپنی صاف بیانی کی وجہ سے غیر مرغوب ہیں ۔ ان کی شاعرانہ قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے ۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی بہار نہ آتی ۔''[۲۳]

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ اقبال اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔ چنانچہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کے ''منادی'' میں آپ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے جو کچھ لکھا ، اس کے حرف حرف سے درد و غم کا اظہار ہوتا ہے :

''آج ۲۱ اپریل کی صبح کو دلی ریڈیو نے یہ الم ناک خبر سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلمہ قومی شاعر نے ، جنہوں نے ساری دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر پیدا کر دی ، اس دنیا سے انتقال فرمایا ۔ یہ خبر نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو غم گین کرنے والی ہے بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا ۔ کیونکہ مرحوم اقبال ایشیا کی پرانی تہذیب کے حامی اور مددگار تھے ، اس لیے ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ مرحوم کا دل دادہ : حسن نظامی''[۲۴]

اس کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء کے ''منادی'' میں تحریر فرمایا :

۲۳- میلادی جنتری ۱۳۵۵ ہجری ۔

۲۴- منادی دہلی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء ۔

اقبال کی وفات کے وقت آخری الفاظ یہ تھے :

''میں موت سے نہیں گھبراتا ۔ میں مسلمان ہوں ۔ ہنسی خوشی موت کا استقبال کروں گا ۔''

میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب جناب ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا ۔ وہ چونکہ محب اہل بیت تھے اور تفضیلی عقائد رکھتے تھے ، اس لیے قدرت نے ان کو چہلم سیدالشہداء علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی ۔

ہندوستان کے ہر باشندے نے ، چھوٹا ہو یا بڑا ، اس صدمے کو قومی اور ملکی صدمہ محسوس کیا اور ہندوستان کے باہر بھی ایک تہلکہ برپا ہو گیا ، جس سے ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

مرحوم جب تعلیم کے لیے یورپ جا رہے تھے تو درگاہ حضرت خواجہ نظام‌الدین اولیاء میں حاضر ہوئے تھے اور ایک نظم بھی نذر کی تھی جس کے حسب ذیل اشعار بہت مقبول ہوے تھے :

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال* کا ہم نام ہوں

اس سفر کے وقت مرحوم کے ساتھ میر نیرنگ صاحب وغیرہ شعرا بھی تھے جو سب جمع ہو کر میرزا غالب کے مزار پر گئے تھے اور میں نے دلی کے مشہور قوال ولایت خاں کو بلایا تھا ۔ ولایت خاں اس وقت نو عمر لڑکا تھا ۔ سر محمد اقبال نے غالب کی لوح مزار کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر سر جھکا لیا تھا اور ولایت خاں نے غالب کی یہ غزل گائی تھی :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اس شعر کو ولایت خاں نے اس طرح ادا کیا تھا کہ سب پر ایک کیف الم طاری تھا ۔ مگر آج جب اقبال کے مرنے کی خبر آئی تو اس ولایت خاں قوال نے ، جو اب بوڑھا ہو گیا ہے ، دلی ریڈیو میں خود اقبال کی ایک غزل گائی اور ایسے درد انگیز لہجے میں کہ سب سننے والے رونے لگے ۔

آج رات کو پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے نے دہلی ریڈیو میں مرحوم اقبال کی نسبت ایک بہت اچھا مضمون سنایا تھا ، جس کے بعد ریڈیو والوں نے خبریں سناتے وقت کہا کہ مرحوم اقبال نے اپنے قدیمی خدمت گزار نوکر علی بخش کی گود میں جان دی ۔ یہ سن کر مجھ پر بہت اثر ہوا ، اتنا اثر جو گورنر

*خواجہ محمد اقبال حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک مقبول خدمت گزار کا نام تھا ۔ ان کے نام کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے ۔

پنجاب اور سرٹیگور اور صدر کانگرس اور مسٹر جناح کے بیانات سے بھی نہیں ہوا تھا ۔ کیونکہ آقا اور نوکر کی یہ وفاداریاں اور باہمی الفتیں اب خواب و خیال ہو گئی ہیں ۔ ہر چیز میں ظاہر داری اور نمائش ہوتی ہے ۔ دلی تعلق بہت کم ہوتا ہے ۔ پس مجھ پر اثر اس لیے ہوا کہ اقبال سچ مچ پہاری مٹنے والی تہذیب کی ایک نشانی تھے ، جن کے مستقل طرز عمل اور برتاؤ نے ان کے نوکر علی بخش کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ آخر وقت تک ساتھ رہا ۔ اس لیے میں نے تعزیت نامہ علی بخش کو بھیجا ہے ، مرحوم کی اولاد کو نہیں بھیجا ۔ اولاد کے پاس میں خود ماتم پرسی کرنے جاؤں گا ۔ اس وقت تو خطاب کے قابل میں نے علی بخش نوکر کی محبت دیکھی ۔ کیونکہ میرے کان میں اقبال کی آواز گونج رہی تھی : ''علی بخش حقہ بھر لا ۔ اندر سے جاوید کو لا ۔ خواجہ صاحب سے ملا'' ۔

اقبال کے مرنے سے ہندوستان ہی سونا نہیں ہوگیا بلکہ ایشیا بھر میں اندھیرا چھا گیا ۔ ہزہائی‌نس نواب صاحب بھوپال تمام ایشیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں ، جنہوں نے اقبال کی قدر کی تھی اور پانچ سو روپے ماہوار پیش کرتے تھے ۔ امید ہے کہ مرحوم کے اہل و عیال کو بھی نواب صاحب فراموش نہیں کریں گے ۔

حسن نظامی
۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع[۲۵]

علامہ اقبال نے جس آزاد اسلامی مملکت کا تخیل پیش کیا تھا ، وہ ۱۹۴۷ع میں پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور اہل پاکستان نے اس مفکر اعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ''یوم اقبال'' پہلے سے زیادہ شاندار طریق پر منانا شروع کیا ۔ ۱۹۵۲ع میں خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی لاہور میں ہونے والے ''یوم اقبال'' میں شرکت کی دعوت دی گئی ۔ انھوں نے لاہور آنا تو خوشی سے قبول کر لیا لیکن بیماری اور ضعف کے سبب وہ سفر اختیار نہ کر سکے ، اس لیے انھوں نے اپنا مضمون لکھ کر لاہور میں اپنے خلیفہ جناب محمد حسین نظامی کو بھیج دیا کہ وہ اسے طبع کرا کے جلسے میں تقسیم کر دیں ۔ یہ مضمون علامہ اقبال کے متعلق خواجہ صاحب کی آخری تحریر ہے اور اس لحاظ سے نہایت قیمتی ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور نہایت فراخ دلی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنے تمام مریدوں اور عقیدت مندوں کو اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہنے کی تلقین کی ہے :

لاہور کے یوم اقبال کی خبر سن کر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ خود لاہور

۲۵- منادی دہلی ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ع ۔

آؤں اور یوم اقبال میں اپنا یہ مضمون پڑھوں مگر بڑھاپے اور بیماری اور بینائی کی خرابی کے سبب لاہور کا سفر نہ کر سکا۔

گزشتہ سال دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر صاحب نے میری صدارت میں یوم اقبال کا جلسہ کیا تھا جہاں اسلامی دنیا کے سفیر بھی موجود تھے اور پنڈت زار صاحب اور ان کے فرزند پنڈت گل زار صاحب وغیرہ ہندوؤں نے بہت اچھی تقریریں کی تھیں اور نظمیں سنائی تھیں اور میں نے اپنی صدارتی تقریر میں مصر کے سفیر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ سر محمد اقبال مرحوم کشمیری برہمن تھے اور کشمیری برہمنوں کا تعلق مصر سے ہے کیونکہ مصر میں سورج کے مندر کے بڑے پجاری مہنت ہری ہر تھے اور مصری زبان میں سورج کو ''را'' کہتے ہیں۔ قرآن شریف کی سورہ یوسف بھی ''الف لام را'' سے شروع ہوتی ہے یعنی ''را'' کا لفظ خداتعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

مہنت ہری ہر کی شادی قبطی فرعون کی لڑکی سے ہوئی اور فرعون لاولد مر گیا تو مہنت ہری ہر کو فرعون بنا دیا گیا اور ان کی اولاد چار سو برس تک مصر پر حکومت کرتی رہی اور نئے انقلاب کے سبب نیا خاندان حاکم ہو گیا اور ہری ہر کی اولاد حضرت موسیٰ کی یہودی قوم کے ساتھ مصر سے نکلی۔ حضرت موسیٰ فلسطین چلے گئے اور ہری ہر کی اولاد افغانستان میں آ گئی۔ یہاں اس نے ہری نام کا ایک شہر آباد کیا جس کو بعد میں ہرات کہنے لگے۔ اس کے بعد یہ لوگ کشمیر میں آئے اور کشمیر سے ہندوستان میں آئے اور گنگا کے کنارے اپنے مورث کے نام پر ہری دوارتیرتھ بنایا۔

لہذا ہندوستان کے کشمیری برہمن سب مصری ہیں اور چونکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی کشمیری برہمن تھے، اس لیے اقبال بھی مصری تھے اور نہرو جی بھی کشمیری برہمن ہونے کے سبب مصری ہیں۔

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے میرے تعلقات اتنے زیادہ تھے کہ وہ بار بار دہلی میں میرے پاس آتے تھے اور میں بار بار ان کے پاس جاتا تھا۔

وہ ساری اسلامی دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرکے کل جہان میں پاکستان بنانا چاہتے تھے اور ان ہی کی تحریک سے میں نے ۱۹۱۱ء میں مصر، فلسطین، شام اور حجاز کا سفر کیا تھا اور واپس آ کر میں نے اقبال سے کہا تھا کہ مذکورہ ملک انگریزی تہذیب کے اس قدر دل دادہ ہو گئے ہیں کہ مجھے وہاں اسلامی اتحاد کی امید نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اقبال نے مثنوی اسرارخودی لکھی اور حضرت حافظ شیرازی کے کلام پر اور بعض صوفیوں کے عقائد ترک دنیا پر تنقید کی، جس کو میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ناموزوں خیال کرکے اس سے اختلاف کیا اور کچھ عرصے تک اخبارات میں اختلافی مضامین شائع ہوئے۔ آخر کار میرا ان کا اتحاد خیال ہو گیا اور میں نے تسلیم کر لیا کہ ترک دنیا کا وہ تخیل جو بعض صوفیائے کرام

کا ہے وہ وقت حاضر کے لیے موزوں نہیں ہے کیونکہ قرآن میں خدا نے جو دعا سکھائی ہے اس میں دنیا کی بھلائی کو مقدم اور آخرت کی بھلائی کو مؤخر رکھا ہے۔

اس کے بعد میں نے دہلی کے پاکستانی یوم اقبال میں کہا تھا کہ میرے مریدوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ میری اور اقبال کی صفائی اور صلح ہو گئی تھی اور ہم دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے میرے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی شان میں کئی قصیدے لکھے تھے اور ایک قصیدے میں یہ شعر تھا :

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

اور اسی قصیدے میں حضرت کے خادم خاص خواجہ محمد اقبال صاحب کی نسبت ایک شعر تھا :

محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہمنام ہوں

اور یہ شعر بھی تھا :

جا ہی پہنچے گی صدا لاہور سے دہلی تلک
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں ہم کو

سوامی شردھانند کی تحریک شدھی اور میری جوابی تحریک تبلیغ کے ایام میں لاہور کے لالہ لاجپت رائے صاحب نے مظفر پور بہار کے جلسے میں کہا تھا کہ ہندو قوم کا ہاضمہ قوی ہے۔ وہ یونانی سکندر کے ساتھیوں کو ہضم کر گئی اور اب ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی ہضم کر جائے گی۔ اس کے جواب میں پٹنہ جاکر میں نے تقریر کی تھی کہ لاجپت رائے صاحب اپنے دعوے کا ثبوت پیش کریں اور میں اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ مسلمانوں کا ہاضمہ بہت مضبوط ہے جو کشمیری برہمن اقبال کو ہضم کر گئے اور راجپوت قوم کے میاں سر فضل حسین کو ہضم کر گئے۔ اس تقریر کو اخباروں میں پڑھ کر جو خط سر اقبال نے مجھے لکھا تھا وہ آج تک موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے تھے۔

آخر میں مجھے یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم ایسا پاکستان چاہتے تھے جو یورپ کی تہذیب کے ہر اثر سے پاک ہو — لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو اقبال کے اس خیال پر غور کرکے اپنے حالات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ یورپ کی تقلید سے کتنے آزاد ہیں۔

لاہور میں ایسے اصحاب موجود ہوں گے جن کو شاید یاد ہو کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں اقبال نے اپنی نظم سنائی تو میں نے اپنے سر کا عمامہ اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا :

تمہارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو

اور اقبال کی نظم اور میرے خیالات اور میرے عمل کا حاضرین پر بہت اثر ہوا تھا ۔

میرا مقصد اس تحریر سے یہ ہے کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور ممکن ہے کہ میرے بعد میرے مریدوں میں یہ غلط فہمی باقی رہے کہ مجھ میں اور اقبال میں بعض مسائل تصوف کے سبب اختلاف تھا ، اس لیے میں لاہور کے جلسۂ عام میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ میں اور اقبال میں کسی قسم کا اختلاف باقی نہ رہا تھا اور میں آج تک اقبال کے ان خیالات کا حامی ہوں جو انھوں نے بعض اہل تصوف کے خیالات ترک دنیا کے خلاف ظاہر کیے تھے ۔

میں پاکستانی مریدوں اور دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہیں اور قرآن کے اس حکم کو سامنے رکھیں جس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے :

ولا تنس نصیبک من الدنیا (اے انسان ! مت بھول اپنے دنیاوی حصے کو)

اقبال کے کلام میں دنیا کے حصے کو حاصل کرنے کے ساتھ ہی یورپ کے منکر دین حصے سے بچنے کی تلقین بھی ہے[۲۶] ۔

خواجہ حسن نظامی جو ۲ محرم ۱۲۹۶ھ/۱۸۸۰ع کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے ، اپنی خدا داد صلاحیتوں اور زبان دانی کے فطری جوہر دکھا کر ۱۷ ذی‌الحجہ ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ع میں اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ وہ اُردو کے صاحب طرز ادیب بلکہ اپنے رنگ کے فرد وحید تھے ۔ ان کی سبق آموز اور زندگی افروز تحریروں سے پاک و ہند نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ عوام نے ان کی رنگین بیانی اور شگفتہ سرائی سے لطف اٹھایا تو خواص نے زبان کے چٹخارے کے ساتھ حکمت و تصوف کے گھرہائے گراں مایہ سے اپنے جیب و دامن بھرے ۔ علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۴ع میں ''یوم حسن نظامی'' کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے فرمایا :

''علامہ اقبال کے حضرت خواجہ حسن نظامی سے گہرے مراسم تھے بلکہ ان کی ذات سے خاص محبت تھی ۔ ایک دو بار جب میں علامہ کی معیت میں دہلی گیا تو نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دینے کے بعد مجھے حضرت کے ہاں لے گئے ۔ بچپن میں مجھے حضرت کی تصانیف پڑھنے کی ترغیب بھی علامہ ہی نے دی ۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں حضرت کی تصانیف میں مغل شہزادیوں کی مفلوک الحالی کے متعلق پڑھا کرتا تھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے تھے ۔ ایک مرتبہ میں نے علامہ سے ذکر کیا کہ حضرت کا انداز تحریر غیر معمولی

۲۶- ادبی دنیا ، لاہور مئی ۱۹۶۵ع ، ص ۹ - ۱۱ -

طور پر موثر ہے ۔ فرمانے لگے کہ حضرت درد مند ہیں اور ہر درد مند کا انداز تحریر موثر ہوا کرتا ہے ۔

''مجھے ابھی تک حضرت کا چہرہ یاد ہے ۔ دراز گیسو ، شفقت بھری نگاہیں اور شخصیت سادگی و عجز کی ایک نادر مثال ۔ ہر وقت مسکراتے رہتے ۔ مجھے فخر ہے کہ میرے سر پر اس بزرگ ہستی کا دست شفقت رہا ہے اور میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ان کا ذکر چھیڑ کے ایک پرانی یاد تازہ کر دی[۲۷] ۔''

یہ ہے مختصر سی جھلک ان بزرگ ہستیوں کی دوستی کی ، جو اُلفت و یگانگت کے رشتوں میں جکڑی ہوئی تھیں اور جن کے مخلصانہ اور بے غرضانہ تعلقات چالیس سال کی طویل مدت میں پھیلے ہوئے تھے ۔ وفا کی سطح سے گزری ہوئی دنیا میں غرض کے بندے تو بے شمار ملیں گے مگر ایسی مثالیں کم ہی نظر آئیں گی :

دلِ غم دیدۂ انجام لرز جاتا ہے
اب جو دو شخص بہم عہد وفا کرتے ہیں

۲۷- ادبی دنیا ، لاہور جولائی ۱۹۶۵ع ، ص ۷۳ ۔

اسرار خودی (کشمیری ترجمہ)

از

غلام احمد ناز کل گامی

صفحات : ۹ + ۱۷۹ مجلد قیمت : ۳ روپے

سائز : ۱۸ × ۸/۲۲

اقبال اکادمی - کراچی

مکاتیب اقبال

بنام گرامی

مرتبہ عبداللہ قریشی مدیر ادبی دنیا

اقبال کے نادر خطوط کا ایک مجموعہ

صفحات : ۱۶ + ۲۴۹ اقبال اور گرامی کے خطوط کے عکس

سائز ۱۸ × ۸/۲۲ مجلد قیمت ۱۲ روپے

اقبال اکادمی - کراچی

جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب

سابق ڈائریکٹر اقبال اکادمی

کی وفات حسرت آیات پر اکادمی کے تمام اراکین اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں ۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے ۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006